جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کی آواز: پیتل کا گھنٹہ

راشدہ خاتون

شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد (یوپی)، موبائل:7052104314

قاضی عبدالستار کا افسانہ 'پیتل کا گھنٹہ' ایک ایسا افسانہ ہے جس کو زمیندارانہ یا جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے گھنٹے کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔اس افسانے کے شائع ہوتے ہی قاضی عبدالستار شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے، اور ان کو اردو کا ایک اہم افسانہ نگار تسلیم کیا جانے لگا۔حصول آزادی کے بعد جس طرح سے حکومتِ ہند نے زمیندارانہ نظام کو رد کر دیا، اور اس نظام کو ایک بوسیدہ دری یا چٹائی کی طرح سے لپیٹ دیا گیا۔جس کی وجہ سے بڑے بڑے صاحب ملکیت لوگ زمین پر آ گئے۔ نہ صرف زمین پر آ گئے بلکہ ان کے آگے کفالت شعاری کا شدید مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ایک ایسا زمین دار جس نے کبھی اپنے ہاتھ سے ایک گلاس پانی بھی نہ پیا ہوگا، جس کو عدالت تک طلب نہ کر سکتی ہو اور جس کے لیے بندوقوں کا لائسنس حاصل کرنا نہایت حقیر کام سمجھا جاتا ہو اس زمیندار کے لیے اپنی شان وشوکت، رعب و جلال کی وجہ سے کسی کے در پر نوکری کرنا نہایت ہی اہانت آمیز بات لگتی تھی۔ نتیجتاً زمینداروں کے آگے بھوکوں مرنے کی نوبت آ گئی اور گھر کی قیمتی اشیا دھیرے دھیرے فروخت ہونے لگیں۔ان تمام واقعات و حادثات کی بازگشت قاضی عبدالستار کے اکثر افسانوں میں نظر آتی ہے۔

اس افسانہ میں مصنف کا درد اور مرکزی فکر متن میں اس قدر رچ بس گئی ہے کہ اس کو آسانی سے سمجھ پانا مشکل ہے اور کہیں پر بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ مصنف نے جان بوجھ کر کوئی واقعہ بیان کیا ہو۔ بلکہ افسانہ کو پڑھ کے ایسا لگتا ہے کہ اس میں کوئی عام واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ اس افسانے کی بنیادی فکر کو سمجھنے کے لیے ہمیں زمینداری کے عروج وزوال اور تہذیب و ثقافت سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔ جو اس افسانے کے متن میں پوشیدہ ہے۔

'' پیتل کا گھنٹہ'' زمین داروں کی رخصت ہوتی تہذیب و ثقافت زوال پذیر معاشرے اور نظام کا وہ قصۂ پارینہ ہے جس میں بھسول اسٹیٹ کے زمیندار قاضی انعام حسین کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس میں راوی کو قاضی انعام حسین کے دور کے رشتے دار کے طور پر دکھایا گیا۔ راوی کہیں جا رہا تھا تبھی لاری کا انجن خراب ہو جاتا ہے۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود بھی انجن کام نہیں کرتا۔ لاری کے سبھی لوگ اُتر جاتے ہیں اور بیڑی اور سگریٹ سلگانے لگتے ہیں۔

تبھی ایک دیہاتی آدمی راوی کے ہاتھ سے آدھی جلی ہوئی تیلی نکال لیتا ہے۔ راوی اس کی بے تکلفی پر ناگواری کا اظہار کرتا ہے، مگر کچھ بول نہیں پاتا۔ کیوں کہ ہندوستان کی آزادی اور دستورِ ہند کا عمل اور برابری کا قانون نافذ ہونے کی وجہ سے عام انسان بھی آگے بڑھنے اور تمام حقوق پانے کا حقدار ہو گیا۔ جب کہ زمیندار کے رعب وجلال کے آگے ایک عام انسان کی ہمت نہیں تھی کہ وہ زمینداروں کے آگے ذرا سا بھی بے تکلف ہو جائے، مگر وقت کی ستم ظریفی نے ان کو یہ دن دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

راوی کے دریافت کرنے پر یہ کون سا گاؤں ہے۔ بھسول کا نام سنتے ہی راوی کو اپنی شادی یاد آ جاتی ہے اور زمیندارانہ نظام کی شان وشوکت راوی کے ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے اور اس کو قاضی انعام حسین جو بھسول کے زمیندار تھے، جن کے چاروں طرف خدمت گاروں کی ایک ٹولی ہمیشہ جمع رہتی تھی، جن کی حکومت اور دولت کے افسانے راوی نے اپنے گھر میں سن رکھے تھے۔ غرض راوی پگڈنڈی کے راستے ہوتے ہوئے گزرتا ہے تبھی اس کی نظر قاضی انعام حسین کی بنوائی ہوئی مسجد پر پڑی جس کے چاروں طرف عمارتوں کے بجائے اس کا ملبہ دکھائی دیتا ہے۔ وہاں پر نہ تو کوئی آدم ہے اور نہ ہی آدم زاد۔ راوی جب اپنی سسرال تک پہنچتا ہے تبھی ڈیوڑھی سے قاضی انعام حسین لمبے قد کے جھکے ہوئے، ڈورے کی قمیص، میلا پاجامہ اور موٹر ٹائر کے تلوؤں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے ماتھے پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اس افسانے میں قاضی صاحب نے حلیہ، پوشاک، ساز وسامان اور الفاظ کے ساتھ مہمان نوازی کے انداز سے زمینداروں کے اوپر گزرے تغیرات زمانہ اور وقت کے جبر، ظلم وستم کو نہایت باریکی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک ایک لفظ میں ایک تاریخ، ایک تہذیب سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس سانس کے زیر و بم میں ایک عہد کے عروج

وزوال کو محسوس کر سکتے ہیں۔

افسانے کا ایک اقتباس پیش کرتی ہوں:

''ہم اس چکردار ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے جس کی اندھیری چھت کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی دھنّیوں کو گھنے ہوئے بدصورت شہتیر روکے ہوئے تھے۔

وہ ڈیوڑھی ہی سے چلائے ارے سنتی ہو.....دیکھو تو کون آیا ہے میں نے کہا اگر صندوق وندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کر لو جلدی سے، لیکن دادی تو سامنے ہی کھڑی تھیں۔ دھلے ہوئے گھڑوں کی گھڑونچی کے پاس دادا ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ وہ بھی شرمندہ سی کھڑی تھیں۔ پھر انھوں نے لپک کر گھر کی الگنی پر پڑی مارکین کی دھلی چادر گھسیٹ لی اور دوپٹہ کی طرح اوڑھ لیا۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر دیا کہ کرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چمکتا پیوند چھپ جائے۔''[1]

سماجی رشتوں اور روایتی قدروں کی پاسداری پر قاضی صاحب نے نہایت باریک بینی سے نظر ڈالی ہے۔ مہمان کی خاطر مدارات کرنے کے لیے میاں بیوی متفکر ہوتے ہیں اور نظریں نہیں ملا پاتے۔

اقتباس:

''.....جس پر میلے کپڑے، کتھے چونے کی کلیاں اور پان کی ڈلیاں ڈھیر تھیں اور آنکھوں سے کچھ اور سوچ رہی تھیں۔''[2]

یہاں آنکھوں سے کچھ اور سوچنے کا مطلب مہمان کی خاطر داری سے ہے کیونکہ گھر میں چند ٹوٹے پھوٹے برتنوں کے علاوہ نہ تو کوئی اشیا نہ ہی پیسے تھے۔

آگے کے اقتباس ملاحظہ ہوں:

''(قاضی انعام حسین).....دونوں کے ہاتھوں میں خدمت گاروں کی طرح طباق اٹھائے ہوئے آئے۔ جس میں الگ الگ رنگوں کی دو پیالیاں ''لب سوز'' لب بند چائے سے لبریز رکھی تھیں۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں دو ابلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیے گئے تھے۔''[3]

اس اقتباس میں قاضی صاحب کی باریک بینی کو داد دینی پڑتی ہے۔ دو رنگ کے چائے کے پیالے کہنے کا مقصد زمین داروں کی اس ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت کی ایک کہانی پوشیدہ ہے۔ جس میں خوبصورت اور قیمتی سامانوں سونے، چاندی، پیتل، تانبہ کا برتن استعمال کرنے والے لوگ آج دو رنگ کے برتن میں چائے پینے پر مجبور ہیں۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں انڈے کاٹ کر پھیلا دینا ان کی مفلسی کو ظاہر کرتا ہے۔ جن کے ابروؤں کے ایک اشارے پر انواع واقسام کے کھانوں سے دسترخوان سجا دیے جاتے تھے آج انڈوں کو کاٹ کر پھیلانے کی نوبت آ گئی ہے۔

قاضی صاحب نے اس افسانے میں زمین داروں کو جس طرح سے بے بس اور مجبور دکھایا ہے اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی جو قابلِ غور بھی ہے اور پُرکشش بھی۔ ترقی پسند تحریک کے تحت جس طرح سے یک رنگی طریقۂ تخلیق رائج الوقت تھا جس میں ہر زمین دار ظالم و جابر اور ہر کسان مظلوم و مجبور تھا۔ قاضی صاحب نے اس یک رنگی نظریہ سے الگ ہٹ کر اردو افسانے کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ بلکہ آزادی کے بعد زمینداروں کے اوپر جس مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اس کی سچی اور حقیقی داستان کو پیش کیا۔

قاضی صاحب کے فن کا خاص وصف یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف زمینداروں کی حالت زار کو بیان کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان تمام عادات و اطوار، عیش پرستی، عیاشی، قتل و غارت گری، بے جا مصارف اور دیگر برائیوں کو بھی بیان کرنے سے اجتناب نہیں کیا جس کی وجہ سے آج انھیں یہ دن دیکھنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر احمد خاں قاضی صاحب کے فکر وفن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''انھوں نے زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے پس منظر میں انسانی رشتوں کو جس دردانگیز پیرائے میں پیش کیا ہے یہ انہی کا حصہ ہے۔ پریم چند کے بعد قاضی صاحب کا شمار ان اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے دیہی زندگی اور دیہی معاشرت کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ انہی خصوصیت کی بنا پر انھیں اردو کا دوسرا پریم چند کہا جاتا ہے۔''[4]

افسانے میں جب راوی نہانے جاتا ہے تو اسے وہاں پر پیتل کا گھنٹہ دکھائی دیتا ہے جو بھسول اسٹیٹ کی اعلان ریاست کی شان میں ایک صدی سے بجتا چلا آ رہا تھا جو مونگیوں کی مار سے داغ دار ہو گیا تھا۔

دوسرے دن جب راوی رخصت ہونے لگتا ہے تو دادی اس کے بازو پر امام ضامن باندھتی ہیں اور اکاون روپے مٹھائی اور ۱۰ روپے کرائے کے لیے دیتی ہیں۔ جب راوی اس کے لیے منع کرتا ہے تو کہتی ہیں۔ اقتباس:

''چپ رہو تم.....تمہاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں جو جن کا حق ہوتا ہے وہ دے تو دیتے ہیں۔ غضب خدا کا تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آؤ اور میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چٹ بھی نہ دے سکوں۔ میں.....بھیّا.....تیری دادی تو فقیرن ہو گئی.....بھکارن ہو گئی۔

معلوم نہیں کہاں۔ کہاں کا زخم کھل گیا تھا وہ دھاروں دھار رو رہی تھی۔''[5]

اس اقتباس میں قاضی صاحب نے جس شدت کے ساتھ ان کرب و

اذیت سے ان کی حالت زار کو بیان کیا ہے جس میں قاری خود کو شریک مانتا ہے اور ایک عجیب سے احساس ندامت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں کا زخم کھل گیا تھا۔ اس جملے میں زمین داروں کی شان وشوکت، عظمت، رتبہ، جاہ وجلال، رعب ودبدبہ کی یاد دلاتا ہے جس کو آسانی سے بھول جانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

وہ طبقہ جو امتیازی شان کے ساتھ زندگی گزارتا تھا۔ زمین داری کے خاتمے کے بعد کس طرح نان شبینہ کا محتاج ہو گیا۔ وہ کوٹھیاں، محلات، حویلیاں نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے تمام حکومت عصر اور تبدیلی وقت کے ہاتھوں لوگوں میں چلے گئے۔ وہ لوگ جو کل تک اس طبقہ کے یہاں کھاتے پیتے اور کام کرتے تھے آج سماج کے اعلیٰ طبقوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ کل کا کسان آج کا زمیندار بن گیا۔ سرپنچ مکھیا اور تھانے دار بن گیا اب یہاں کے زمینداروں کے محلات، حویلیوں اور کوٹھیوں کے صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ گزشتہ آن بان اور شان ختم ہو چکی ہے انہی کھنڈرات اور عظمتِ رفتہ کے نشانات کو قاضی صاحب نے اپنی تخلیق میں پُرجلال زبان اور بے مثال اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

جب راوی یکّے سے رخصت ہوتا ہے تو یکّہ والا ایک سواری کو بٹھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ بھسول کے ساہوکار ہیں۔ جب ساہوکار جی یکّہ پر سوار ہو جاتے ہیں تو یکّے والا ان کے سامنے پیتل کا گھنٹہ لا کر رکھ دیتا ہے۔

اس افسانے میں قاضی صاحب نے قاضی انعام حسین کے ذریعہ زمیندارانہ نظام کی اس تہذیبی اقدار کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو زمیندارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی پوری طرح ختم ہو چکی ہے۔ اس افسانے میں قاضی انعام حسین کے پاس اپنے مہمان کی میزبانی کرنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تو وہ اپنی ریاست کی آخری نشانی کو فروخت کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے اور بیچ کر اپنی مہمان کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمارے دل میں زمیندارانہ طبقے کی وہ اونچی تہذیبی اور اخلاقی اقدار پیوست ہو جاتی ہیں۔ زمینداری کے خاتمے کے ساتھ ہی ان کی سماجی زندگی کا رخ اچانک بدل جاتا ہے۔ ان کی پوری تہذیبی روایت غریبی کا شکار ہو جاتی ہے۔ تہذیب کی یہی اعلیٰ روایت بار بار قاضی صاحب کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور انھیں اپنی اسی تہذیبی اقدار سے لاشعوری طور پر جو ایک وابستگی تھی جس سے وہ خود کو الگ نہیں کر پاتے ہیں اور جس کا بار بار ذکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

اس کے بارے میں ابوالکلام قاسمی فرماتے ہیں:

''ان کا غیرت مند میزبان اپنی ریاست کی آخری نشانی فروخت کر کے ریاست کی یاد سے بھی دست بردار ہونا گوارا کر لیتا ہے۔ مگر اپنی روایتی مہمان نوازی اور تہذیبی فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرنا گوارا نہیں کرتا۔''[6]

پیتل کا گھنٹہ بک جانے اور ساہوکار کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے اگر ہم اس افسانے کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو ہمیں قاضی انعام حسین زمیندارانہ طبقے کا نمائندہ نظر آتے ہیں۔ جس میں انھوں نے پیتل کا گھنٹہ جو ان کی ریاست کی آخری نشانی کی طرح ان کے پاس موجود تھا۔ جس کو دیکھ کر راوی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ وہ پیتل کا گھنٹہ جس پر قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ کا چاند اور ستاروں کا مونوگرام بنا ہوا تھا، ساہوکار کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ وہ ساہوکار طبقہ جو آزادی کے قبل کسانوں اور مزدوروں کے استحصال میں زمینداروں کا برابر کا شریک کار رہا تھا۔ پرانے نظام کے زوال اور نئے نظام کے عروج، اقتصادی مسائل سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط ایک ایسا خوفناک منظر تھا جس کی وجہ سے مالکن اور محلوں کے اندر رہنے والی عورتیں اپنی قدروں کو چھوڑ کر کفالت شعاری کے لیے کرتے سینے اور محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئیں اور مقروض باپ نے اپنی بیٹیوں کو عمر دراز لوگوں سے بیاہ دیا۔

نئے نظام کے تحت ساہوکاروں کی مالی حالت بہتر ہوئی مگر زمینداروں کو بری طرح شکست وریخت کا سامنا کرنا پڑا اور زمیندارانہ نظام کی جگہ ایک نئے نظام نے جنم لے لیا۔

اس کے بارے میں صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

''اس منظر میں نو آبادیاتی نظام کا استحصالی طبقہ دم توڑ چکا ہے، لیکن پردھان سرپنچ لیکھ پال اور سرکاری افسران کی شکل میں اس طبقے کا وجود ضرور برقرار ہے۔''[7]

ساہوکار کے ہاتھوں میں پیتل کا گھنٹہ چلا جانا ظلم کے اس بدلتے طریق کار کو قاضی صاحب نے طنز بھرے انداز میں نشانہ بنایا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آزادی کے بعد زمین دار تو ختم ہو گئے، مگر ساہوکار، سرمایہ دار جس میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالک آج بھی کسانوں اور مزدوروں کا جس طرح سے استحصال کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے کسانوں اور مزدوروں کی حالت آج بھی ویسی کی ویسی ہی بنی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ آئے دن خودکشی وخودسوزی کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

سرمایہ دار اور ملٹی نیشنل کمپنیاں ایک نئے انداز میں کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کر رہی ہیں جو دکھائی دینے کے باوجود بھی نظر نہیں آتا ہے۔

یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ان کسانوں کی محنت سے تیار کئے گئے سامانوں کو کم

قیمتوں پر خرید کر انھیں اتنے اونچے داموں پر فروخت کر رہی ہیں جس کا اندازہ خریدنے والے کو بھی نہیں ہوتا۔ دو روپے میں ایک کلو خریدے گئے آلو سے وہ ایک پیکٹ میں صرف آدھے آلو سے بنائی گئی چپس کا پیکٹ پانچ روپے میں بیچتے ہیں اور یہ کسان اور مزدور اتنا لاچار اور بے بس ہے کہ ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف چاہتے ہوئے بھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا جس طرح سے اس نے زمیندارانہ نظام کو ختم کرنے کے لئے متحد ہو کر قدم اٹھایا تھا۔

یکے والا جب گھنٹے کے بارے میں ساہوکار جی سے دریافت کرتا ہے تو ساہوکار جی بتاتے ہیں:

''ہاں کل شام معلوم نائی کا وقت پڑا ہے میاں پر کہ گھنٹہ دے ید ہن بلائے کے۔ اپی.... تبھی یکے والا کہتا ہے....''ہاں وقت وقت کی بات ہے۔ شاہ جی ناہیں تو ای گھنٹہ۔۔ اے گھوڑے کی دم راستہ دیکھ کر کے چل.....'' یہ کہہ کر اس نے چابک جھاڑا۔[۸]

وقت وقت کی بات ہے اس جملے میں قاضی صاحب نے ماضی اور حال کی بہترین عکاسی کی ہے۔ وقت جو ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے جس پر کسی کا بس نہیں ہوتا اور ہر عروج کو اپنے پاؤں تلے روند کر ماضی بنا دیتا ہے، مگر ہر دور کی کچھ اعلیٰ قدریں اور نہ مٹنے والی روایتیں انھیں ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید بنا دیتی ہیں۔

اس افسانے میں راوی کو محسوس ہوتا ہے کہ ''میاں'' قاضی انعام حسین کا برا وقت میں ہی ہوں باوجود اس احساس کے اس کا قدم مستقبل کی طرف رہتا ہے کیونکہ وقت کو کوئی روک نہیں سکتا۔

''پیتل کا گھنٹہ'' بیچ کر قاضی صاحب نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ گرچہ زمیندارانہ نظام ختم ہو چکا ہے اور یہ ماضی کا ایک حصہّ بن چکا ہے مگر ایک زمیندار نے اپنی وراثت کی آخری نشانی کو بیچ کر اپنے مہمان کی جو خاطر مدارات کی ہے اس کو لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

عابد سہیل قاضی عبدالستار کی پوری تخلیق اپنی فکر کے محور و مرکز میں لا کر گفتگو کرتے ہیں اور ہر اچھے افسانہ نگار کی تخلیق پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے کہتے ہیں:

''قاضی عبدالستار نے اپنے افسانہ کے فریم میں جڑی ہوئی جس تصویر کا انتخاب کیا ہے وہ شیشہ کے پیچھے اپنا رنگ و روغن چاہے کچھ دن اور برقرار رکھ لے لیکن ہر اس دن کے ساتھ جو گزر رہا ہے وہ نئے سیاق و سباق سے کٹتی جا رہی ہے اور اگلے دس بیس برسوں بعد صرف داستان پارینہ کے طور پر زندہ رہے تو رہے اصل زندگی میں ہرگز موجود نہ ہوگی۔ زندگی کا نسب و نما تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور ہر کردار کو ایک ایسے ملک میں جو ابھی صرف ترقی پذیر ہے اتنی اور ایسی تبدیلیوں سے دوچار کر رہا ہے جتنی اور جیسی پہلی صدیوں میں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ قاضی عبدالستار نے زمینداروں اور اس دور کے نوابین کو اپنی تخلیق کا محور و مرکز بنایا ہے۔ کیا آنے والے وقت میں ان کی تخلیق کی معنویت قائم رہے گی یا وقت جس تیزی سے گزر رہا ہے وہ اس کو پیروں تلے روندتے ہوئے گزر جائے گا۔''[۹]

عابد سہیل صاحب کی اس بات پر غور کریں تو حقیقت صاف نظر آئے گی اور یہ حقیقت نہ صرف قاضی عبدالستار کی تخلیق کے بارے میں کہی جا سکتی ہے بلکہ پوری دنیا کا ادب جس بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ یہ بات تمام ادبیات پر صادق آتی ہے۔ باوجود ابھی بھی ادب کے شوقین زندہ ہیں اور قاضی صاحب کی تخلیق پر بابا ناگارجن کے اس جملے کو یاد کرنا چاہئے۔

بابا ناگارجن نے قاضی عبدالستار کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ قاضی صاحب کی تخلیق کو ہمیں کورس ورک کے روپ میں پڑھنا چاہئے۔

مسلم تہذیب وثقافت کے ساتھ تاریخی عمارتوں کا ذکر جامع مسجد کے دراز نو بیٹھ کر نہ قبول ہونے والی دعا اور مشترکہ تہذیب کے ساتھ اقتدار کی ہوس کی بہت سی مثالیں قاضی صاحب کی تخلیق میں آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہ بات دور حاضر کی روشنی میں دیکھی جائے تو قاضی صاحب کی تخلیق ایک دستاویزی سند رکھتی ہے۔ جس طرح سے کسی ملک یا قوم کی تاریخ تہذیب وتمدن جاننے کے لیے وہاں کے ادب کو پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح سے زمین داروں کی تاریخ ان کی تہذیب وثقافت ساتھ ہی زمینداری کے خاتمے کے اسباب وعلل جاننے کے لیے قاضی عبدالستار کی تخلیق پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

حواشی:

۱۔ پیتل کا گھنٹہ، مصنف قاضی عبدالستار، ص:۹۔۸
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً، ص:۱۰
۴۔ قاضی عبدالستار فکر وفن اور فنکار، مصنف ڈاکٹر احمد خاں، ص:۲۱۱
۵۔ پیتل کا گھنٹہ، مصنف قاضی عبدالستار، ص:۱۱
۶۔ ادیب سہ ماہی اردو فکشن نمبر، جولائی دسمبر ۱۹۹۱ء
۷۔ افسانوی ادب کی نئی قرأت، مصنف پروفیسر صغیر افراہیم، ص:۳۷
۸۔ پیتل کا گھنٹہ، مصنف قاضی عبدالستار
۹۔ پیتل کا گھنٹہ تنقیدی جائزہ، مضمون نگار، عابد سہیل، ص:۲۵۱

○○